رسائل و مسائل

شکار کرنے اور شکار کھیلنے میں فرق

سوال: امیر لوگ آج کل جس طرح شکار کھیلتے ہیں، اسے دیکھ کر دل بے قرار ہوتا ہے۔ سابق زمانہ میں تو شاید لوگ قوتِ لایموت کے لئے شکار کو ذریعہ بناتے ہوں گے۔ مگر آج کل تو یہ ایک تفریح اور تماشا ہے۔ بعض لوگ جنگل یا کسی کھیت میں جال لگا کر خرگوش پکڑتے ہیں۔ پھر ان کو بوریوں میں ڈال کر کسی میدان میں لے جاتے ہیں اور ان کے پیچھے کتے چھوڑتے ہیں۔ خرگوش کو کھلی جگہ میں کوئی جائے پناہ نہیں ملتی تو وہ دوڑ دوڑ کر ہار جاتا ہے اور کتے اسے پھاڑ ڈالتے ہیں۔ اس پر خوب تفریح کی جاتی ہے۔

یہ بھی دریافت طلب ہے کہ بندوق سے شکار کرنا کیسا ہے؟ اس معاملے میں میرے سامنے پارۂ دوم کی یہ آیت ہے کہ واذا تولّی سعیٰ فی الارض لیفسد فیھا و یھلک الحرث والنسل، واللہ لا یحب الفساد۔

کتبِ فقہ میں یہ مسئلہ جو درج ہے کہ تکبیر پڑھ کر شکار پر کتا چھوڑا جائے یا بندوق چلائی جائے تو شکار اگر زخمی ہو کر بغیر ذبح کئے مر جائے تو بھی وہ حلال ہے، اس کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: شکار کھیلنا میرے نزدیک مکروہ ہے، البتہ شکار کرنا جائز ہے۔ شکار کرنے اور کھیلنے میں فرق یہ ہے کہ جو شکار کھانے کے لیے کیا جائے خواہ بہ ضرورت ہو یا بلا ضرورت وہ جائز ہے۔ اور جو شکار محض تفریحاً کیا جائے اور جس میں خواہ مخواہ جانوروں کی جانیں ہلاک کی جائیں وہ اگر ناجائز نہیں تو مکروہ ضرور ہے

کسی جانور پر اگر شکاری کتے یا دوسرے شکاری جانور کو اللہ کا نام لے کر چھوڑا جائے اور وہ شکاری

جانور کے حملے سے مر جائے تو اس کا کھانا از روئے قرآن جائز ہے۔ اور اگر تیر اللہ کا نام لے کر چھوڑا جائے اور اس کی ضرب سے جانور مر جائے تو اس کا کھانا از روئے حدیث جائز ہے۔ پہلی چیز کی دلیل سورۂ مائدہ کے پہلے رکوع میں موجود ہے اور دوسری چیز کی دلیل کے لیے حدیث کی کسی کتاب میں کتاب الصید نکال کر دیکھ لیجیے۔ بندوق کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ کتبِ فقہ میں مذکور نہیں ہے۔

ایک نیا فتنہ

سوال:۔ یہاں کیمبلپور میں ایک صاحبِ علم نے پچھلے ماہ رمضان میں ایک فتنہ کھڑا کیا تھا کہ رمضان کے بارے میں سورۂ بقرہ کی آیات بیک وقت نازل ہوئی تھیں، اس لئے اللہ نے شروع میں جو رعایت دی ہے کہ "جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں، اور پھر نہ رکھیں، تو وہ فدیہ ادا کریں" یہ ایک اٹل رعایت ہے اور اب بھی اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کی حمایت میں آیت ۱۸۳ کے آخری حصہ کو پیش کیا کہ اگر روزہ رکھو تو بہتر ہے اور نہ رکھو تو فدیہ ادا کر دو۔ ان کا کہنا تھا کہ آیت ۱۸۴ پہلی آیات کے ساتھ ہی نازل ہوئی تھی، وہ پہلی آیات کی رعایت کو کیسے چھین سکتی ہے۔

آپ کی تفسیر کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ آیات ۱۸۲ و ۱۸۳ تو جنگ بدر سے پہلے سنہ ۲ھ میں نازل ہوئیں۔ اور آیت ۱۸۴ ایک سال بعد نازل ہوئی۔ اگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو پھر اُن کے اِس خیال کی تردید ہو سکتی ہے کہ آج بھی ایک تندرست ہٹا کٹا انسان فدیہ دے کر روزے کی فرضیت سے بچ سکتا ہے۔

مذکورۂ بالا صاحب اپنے آپ کو علم حدیث کے استاد اور قرآن کے مفسّر سمجھتے ہیں۔ اور ہر دو کے متعلق اپنے افکار و خیالات دنیا کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ آپ براہ مہربانی کچھ تکلیف گوارا کر کے اُن کتب کا حوالہ دے دیں جن سے آپ کو ثبوت ملا ہو کہ آیات ۱۸۲ اور ۱۸۳ تو سنہ ۲ھ میں جنگ بدر سے پہلے نازل ہوئیں، اور آیت ۱۸۴ ایک سال بعد نازل

ہوئی۔ اس طرح ہمارے پاس ایک سند ہو جائے گی اور ہم انہیں اپنے فاسد خیالات کی نشر و اشاعت سے باز رکھنے کی کوشش کریں گے۔ یہ اسلام کی ہی خدمت ہے۔ امید ہے کہ آپ ضرور ہمیں اپنے افکارِ عالیہ سے مستفید فرمائیں گے۔

جواب: ۔ اس سوال میں جس فتنے کا ذکر کیا گیا ہے اُس کا منشا تو خود اس کے موضوع و مضمون ہی سے ظاہر ہے۔ اس کے مصنف کا صاف مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان میں روزے رکھنے کی "مصیبت" سے خود بھی بچیں اور اپنے ہم مشرب "صاحب لوگوں" کو بھی بچائیں۔ عام فساق غنیمت ہیں کہ کھلی کھلی نافرمانی کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور جو نافرمانی کرنا چاہتے ہیں اسے بے محابا کر گزرتے ہیں۔ ان میں کم از کم یہ مکاری موجود نہیں ہے کہ خدا کی نافرمانی کرنے کے لئے خود خدا ہی کی کتاب کو حجت بنائیں۔ لیکن یہ نرالی قسم کے فساق وہ ہیں کہ اپنے فسق و فجور کے لئے قرآن کو آڑ بناتے ہیں، اور قرآن سے یہ خدمت لینے ہی کے لئے انہوں نے اس کا رشتہ حدیث سے توڑا ہے تاکہ اس کی آیات کو جیسے چاہیں معنی پہنائیں۔ ان لوگوں کو آج کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے۔ جس جس طرح چاہتے ہیں خلقِ خدا کو خدا کی کتاب کا نام لے لے کر خدا کے دین سے پھیرتے ہیں۔ پہلے انہوں نے "دو قرآن" تصنیف کئے تھے۔ پھر "دو اسلام" وضع کئے۔ آگے چل کر یہ "دو خدا" بھی بنا ڈالیں تو کون ان کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے۔

روزوں کے بارے میں قرآن سے جو غلط استدلال انہوں نے کیا ہے اس کی غلطی واضح کرنے کے لئے سب سے پہلے ہم خود قرآن کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ زیرِ بحث آیات کا لفظی ترجمہ یہ ہے:

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، لکھ دیئے گئے تم پر روزے جس طرح لکھے گئے تھے تم سے پہلے کے لوگوں پر، تاکہ تم پرہیزگاری کرو۔ روزہ رکھنا چند گنے چنے دنوں کا۔ پھر جو کوئی تم میں سے مریض ہو، یا سفر پر ہو، تو پورا ہونا چاہیے شمار دوسرے دنوں سے۔ اور جو لوگ اُس کی (یعنی روزے کی) طاقت رکھتے ہوں اُن پر فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا۔ پھر جو کوئی رضاکارانہ بجا لائے نیکی تو وہ بہتر ہے اُسی کے لئے۔ اور یہ کہ تم روزہ رکھو، یہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم علم رکھتے ہو۔ ماہ رمضان وہ ہے جس میں نازل کیا گیا قرآن، رہنما بنا کر انسانوں

کے لئے، اور روشن آیات لئے ہوئے ہدایت اور تفریق حق و باطل کی۔ پس جو پائے تم میں سے
اس مہینے کو تو چاہیے کہ اس کے روزے رکھے۔ اور جو مریض ہو یا سفر پر ہو تو پورا ہونا چاہیے
شمار دوسرے دنوں سے "

(ملاحظہ فرمایئے سورۂ بقرہ رکوع ۲۳۔ اور اصل سے مقابلہ کر کے خوب اطمینان کر
لیجئے کہ اصل اور ترجمے میں معنی کے لحاظ سے کوئی فرق تو نہیں ہے)

اس عبارت کو جو شخص خالی الذہن ہو کر پڑھے گا اس کے دل میں لازماً پہلا سوال یہ پیدا ہوگا کہ اگر یہ پوری عبارت ایک ہی سلسلۂ تقریر کی ہے جو بیک وقت ارشاد ہوئی تھی تو اس میں پہلے ہی یہ کیوں نہ کہہ دیا گیا کہ ماہ رمضان میں تم کو یہ نعمت دی گئی تھی اس لئے تم میں سے جو اس کو پائے اُسے چاہیئے کہ اس مہینے کے روزے رکھے؟ آخر یہ کیا اندازِ بیان ہے کہ پہلے کہا "روزہ رکھنا چند گنے چنے دنوں کا"، پھر تین چار فقروں میں روزوں کے متعلق بعض احکام بیان کئے، پھر بتایا کہ وہ گنے چنے دن رمضان کے ہیں اور رمضان کو اس کام کے لئے اس وجہ سے منتخب کیا گیا ہے اور اس پورے مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ ایک مربوط سلسلۂ تقریر میں شاید ایک اناڑی بھی اپنی بات یوں ادا نہ کرتا، بلکہ یوں کہتا کہ اگلی قوموں کی طرح تم پر بھی روزے فرض کئے گئے ہیں، اور چونکہ رمضان کے مہینے میں تم کو قرآن کی نعمت دی گئی ہے اس لئے یہ فرض روزے تم اس مہینے میں رکھو۔ اس کے بعد اس کو جو کچھ احکام بیان کرنے ہوتے وہ بیان کر دیتا۔

دوسرا سوال ایک خالی الذہن ناظر کے دل میں یہ پیدا ہوگا کہ اس سلسلۂ عبارت میں جب پہلے یہ فقرہ آچکا تھا کہ "جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو تو پورا ہونا چاہیے شمار دوسرے دنوں سے"، تو اسی فقرے کو بعد میں پھر دُہرانے کی کیا حاجت تھی؟ اور اگر فی الواقع اس کا دُہرانا ضروری تھا تو پھر یہ فقرہ بھی کیوں نہ دُہرایا گیا کہ "جو لوگ اُس کی طاقت رکھتے ہوں ان پر فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا"؟ حقیقت میں ضرورت تو دونوں میں سے ایک کو بھی دہرانے کی نہ تھی۔ لیکن ایک کو دہرانا اور دوسرے کو نہ دُہرانا تو ایک معمّا سا محسوس ہوتا ہے؟

تیسرا سوال جو اس کے دل میں کھٹکے گا وہ یہ ہے کہ "ماہ رمضان وہ ہے" سے پہلے کی عبارت اور اس

کے بعد کی عبارت کا مضمون ایک دوسرے سے صریحاً متناقض نظر آتا ہے۔ پہلا مضمون صاف طور پر یہ کہہ رہا ہے کہ جو شخص طاقت رکھنے کے باوجود روزہ نہ رکھے وہ فدیہ دے دے، لیکن اگر وہ روزہ ہی رکھے تو یہ اسی کے حق میں اچھا ہے۔ اس کے بالکل برعکس دوسرا مضمون یہ ظاہر کر رہا ہے کہ جو شخص ماہ رمضان کو پائے وہ اس میں ضرور روزہ رکھے، اور اس لازمی حکم کو یہ بات مزید تقویت پہنچا رہی ہے کہ اس حکم کے بعد اس رعایت کا تو پھر اعادہ کر دیا گیا ہے جو پہلے مضمون میں مریض اور مسافر کو دی گئی تھی، مگر اس رعایت کو ساقط کر دیا گیا ہے جو اوپر روزے کی طاقت رکھنے والے کو دی گئی تھی۔ ایک معمولی عقل و خرد رکھنے والے قانون ساز سے بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ایک ہی معاملہ میں وہ بیک وقت دو مختلف احکام دے گا۔ پھر بھلا یہ فعل اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان کیسے ہو سکتا ہے؟

پہلے دو سوالات تو صرف سوالات ہی ہیں، لیکن یہ آخری سوال تو ایک سخت اعتراض ہے جو اس عبارت پر وارد ہوتا ہے، اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص حدیث سے مدد لئے بغیر اسے کیسے رفع کر سکتا ہے جو لوگ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کو سمجھنے کے مدعی ہیں، اور حدیث کو احکامِ دین کا ماخذ اور قرآن کی مستند شرح ماننے سے انکار کرتے ہیں، ان سے پوچھیے کہ ان کے پاس ان سوالات اور اس اعتراض کا کیا جواب ہے؟

اب دیکھئے کہ حدیث کس طرح ہمیں قرآنِ مجید کے اس مقام کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ جن لوگوں کے سامنے قرآن کے یہ احکام نازل ہوئے تھے، ان کا بیان یہ ہے کہ اس عبارت کا ایک حصہ جو "اے لوگو" سے شروع ہو کر "اگر تم علم رکھتے ہو" پر ختم ہوتا ہے، ابتداءً نازل ہوا تھا، اور دوسرا حصہ اس کے ایک سال بعد نازل ہوا۔ پہلے سال روزے فرض کرتے وقت یہ رعایت رکھی گئی تھی کہ آدمی روزے کی طاقت رکھنے کے باوجود اگر روزہ نہ رکھے تو فدیہ دے دے۔ مگر دوسرے سال اس رعایت کو منسوخ کر دیا گیا، البتہ مسافر اور مریض کے لئے سابق رعایت بحال رکھی گئی۔

اس بیان سے نہ صرف یہ کہ سارے اشکالات رفع ہو گئے، بلکہ یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ دوسرے سال آخری اور قطعی حکم دیتے ہوئے یہ تمہید کیوں اٹھائی گئی کہ یہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں تمہیں قرآن جیسی نعمت دی گئی ہے۔ اب بات سمجھ میں آگئی کہ پہلے اللہ کی اس نعمت کا احساس دلایا گیا، پھر حکم دیا گیا کہ اس

نعمت کے شکریے میں تم کو اس مہینے کے روزے ضرور رکھنے چاہئیں۔

محدثین و مفسرین نے یہ تشریح متعدد صحابہ اور تابعین سے نقل کی ہے۔ مثلاً امام احمد ابن حنبل حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے ایک طویل تشریحی بیان نقل کرتے ہیں جس میں وہ فرماتے ہیں کہ نماز اور روزہ، دونوں کی موجودہ صورت بتدریج قائم کی گئی ہے۔ نماز میں پہلے بیت المقدس کی طرف رُخ کیا جاتا تھا، پھر مکے کی طرف رُخ پھیر دیا گیا۔ پہلے لوگ ایک دوسرے کو نماز کے وقت کی اطلاع دیتے تھے۔ پھر اذان کا طریقہ مقرر کیا گیا۔ پہلے طریقہ یہ تھا کہ اگر ایک شخص بیچ کے کسی مرحلے پر آکر جماعت میں شریک ہوتا تھا تو اپنی نماز کا چھوٹا ہوا حصہ ادا کرنے کے بعد امام کی پیروی شروع کرتا تھا۔ پھر یہ طریقہ مقرر کیا گیا کہ جماعت میں جس مرحلے پر بھی آکر شریک ہو، امام کی پیروی میں نماز پڑھنی شروع کر دو، پھر امام کے سلام پھیر دینے کے بعد اٹھ کر اپنی نماز پوری کرو۔ اسی طرح روزے کے احکام بھی بتدریج آئے ہیں۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو آپ ہر مہینے تین دن کے روزے رکھتے تھے، اور ایک روزہ محرم کی دسویں کو رکھا کرتے تھے۔ پھر اللہ نے رمضان کے روزے فرض کئے، مگر یہ رعایت رکھی کہ جو روزہ نہ رکھے وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ اس کے بعد حکم آیا کہ رمضان کے روزے ضرور رکھے جائیں اور تندرست مقیم آدمی کے لئے فدیے کی رعایت منسوخ کر دی۔ پہلے لوگ افطار کے بعد بس اُس وقت تک کھانا پینا اور مباشرت کرنا جائز سمجھتے تھے جب تک کہ سو نہ جائیں۔ سونے کے بعد وہ سمجھتے تھے کہ دوسرے دن کا روزہ شروع ہو گیا۔ اگرچہ اس باب میں کوئی صریح حکم نہ تھا، مگر لوگ ایسا ہی سمجھے ہوئے تھے۔ بعد میں حکم آیا کہ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ الی قولہ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ۔ (ابن کثیر۔ ج ۱۔ ص ۲۱۴)

اس مضمون کی تائید میں بخاری، مسلم، ابوداؤد اور دوسرے محدثین نے متعدد روایات نقل کی ہیں جو حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت سَلَمہ بن اَکوَع رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ مشہور مفسر ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) نے پوری سند کے ساتھ جن صحابہ اور تابعین سے اس کی تائید میں روایات نقل کی ہیں ان کے نام یہ ہیں: معاذ بن جبلؓ۔ ابن عمرؓ۔ ابن عباسؓ۔ سلمہ بن اکوعؓ۔ علقمہ۔ عکرمہ۔ حسن بصری۔ شعبی۔ عطاء۔ زہری۔ ان میں سے ایک روایت میں وہ حضرت معاذ بن جبل کی یہ تصریح

نقل کرتے ہیں کہ پہلے چونکہ اہلِ عرب روزوں کے عادی نہ تھے اور روزہ ان پر سخت گراں گزرتا تھا، اس لئے ان کو یہ رعایت دی گئی تھی کہ رمضان میں جس دن روزہ نہ رکھیں اُس دن کسی مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ بعد میں تاکیدی حکم آگیا کہ پورے مہینے کے روزے رکھو، الّا یہ کہ تم مریض ہو، یا سفر پر ہو۔ ایک اور روایت میں وہ ابن عباس کی یہ تصریح نقل کرتے ہیں کہ پہلے سال کے روزوں میں اللہ تعالیٰ نے فدیے کی رخصت رکھی تھی، مگر دوسرے سال جو حکم آیا اس میں مریض و مسافر کی رعایت تو بحال تھی، لیکن مقیم کے لئے فدیے کی رعایت کا ذکر نہ تھا، اس لئے یہ رعایت منسوخ ہو گئی۔

اس تشریح سے ہر شخص خود اندازہ کر سکتا ہے کہ جو لوگ حدیث سے بے نیاز ہو کر، بلکہ احادیث کو حقارت اور تضحیک کے ساتھ پھینک کر، قرآن سے من مانے احکام نکال رہے ہیں وہ کس طرح خود گمراہ ہو رہے ہیں اور عام مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔

رمضان میں قیام اللیل

براہِ کرم مندرجہ ذیل سوالات کے جواب عنایت فرمائیں :۔

سوال :۔

۱۔ علمائے کرام بالعموم یہ کہتے ہیں کہ تراویح اوّل وقت میں (عشاء کی نماز کے بعد متصل) پڑھنا افضل ہے اور تراویح کی جماعت سنتِ مؤکدہ کفایہ ہے۔ یعنی اگر کسی محلہ میں تراویح باجماعت نہ ادا کی جائے تو اہلِ محلہ گنہ گار ہوں گے اور دو آدمیوں نے بھی مل کر مسجد میں تراویح پڑھ لی تو سب کے ذمہ سے ترکِ جماعت کا گناہ ساقط ہو جائے گا۔ کیا یہ صحیح ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں کیوں ایسا نہیں ہوا؟ اور اس زمانے کے مسلمانوں کے لئے کیا حکم ہوگا؟ کیا وہ سب تراویح باجماعت نہ پڑھنے کی وجہ سے گناہ گار تھے؟

۲- کیا نماز تراویح اوّل وقت میں سونے سے پہلے پڑھنا ضروری ہے؟ کیا سحری کے وقت تراویح پڑھنے والا افضلیت و اولویت سے محروم ہو جائے گا؟ اگر محروم ہو جائے گا تو حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے کہ التی تنامون عنھا افضل من التی تقومون؟

۳- کیا رمضان میں نماز تہجد سے تراویح افضل ہے؟ اگر ایک آدمی رمضان میں عشاء پڑھ کر سو رہے اور تراویح پڑھے بغیر رات کو تہجد پڑھے (جب کہ تہجد کے لئے خود قرآن مجید میں صراحۃً ترغیب دلائی گئی ہے اور تراویح کو یہ مقام حاصل نہیں)، تو اس کے لئے کوئی گناہ تو لازم نہ آئے گا؟

واضح رہے کہ تراویح اور تہجد دونوں کو نبھانا مشکل ہے۔

۴- کیا تراویح کے بعد وتر بھی جماعت سے پڑھنے چاہئیں؟ یا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تراویح سے پہلے وتر پڑھ لے اور رات کے آخری حصے میں تراویح ادا کر لے؟

۵- تراویح کی تعدادِ رکعت کیا ہے؟ کیا صحیح احادیث میں آٹھ، بیس، اڑتیس یا چالیس رکعتیں نبی صلعم سے ثابت ہیں؟

۶- کیا کسی صحابی کو یہ حق حاصل ہے کہ نبی صلعم جس چیز کو یہ کہہ کر رد کر دیں کہ "مازال بکم الذی رأیت من صنیعکم خشیت ان یکتب علیکم ولو کتب علیکم ما قمتم بہ فصلّوا ایھا الناس فی بیوتکم فان افضل صلوٰۃ المرء فی بیتہ الا الصلوٰۃ المکتوبہ" تو وہ اسے پھر باقاعدہ جماعت کے ساتھ مساجد میں جاری کرے؟

جواب:

تراویح کے بارے میں جو کچھ مجھے معلوم ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے زمانوں کی نسبت رمضان کے زمانے میں قیامِ لیل کے لئے زیادہ ترغیب دیا کرتے تھے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز آپ کو بہت محبوب تھی۔

(۲) صحیح روایات سے ثابت ہے کہ حضورؐ نے ایک مرتبہ رمضان المبارک میں تین رات نماز تراویح جماعت کے ساتھ پڑھائی اور پھر یہ فرما کر اسے چھوڑ دیا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ تم پر فرض نہ ہو جائے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تراویح میں جماعت مسنون ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تراویح فرض کے درجہ میں نہیں ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ چاہتے تھے کہ لوگ ایک پسندیدہ سنت کے طور پر تراویح پڑھتے رہیں مگر بالکل فرض کی طرح لازم نہ سمجھ لیں۔

(۳) تمام روایات کو جمع کرنے سے جو چیز حقیقت سے قریب تر معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضورؐ نے خود جماعت کے ساتھ رمضان میں جو نماز پڑھائی وہ اوّل وقت تھی نہ کہ آخر وقت میں۔ اور وہ آٹھ رکعتیں تھیں نہ کہ بیس (اگرچہ ایک روایت بیس کی بھی ہے مگر وہ آٹھ رکعت والی روایت کی بہ نسبت ضعیف ہے) اور یہ کہ لوگ حضور کے پیچھے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے بعد واپس جا کر اپنے طور پر مزید کچھ رکعتیں بھی پڑھتے تھے۔ وہ مزید رکعتیں کتنی ہوتی تھیں؟ اس کے بارے میں کوئی واضح بات نہیں ملتی۔ لیکن بعد میں جو حضرت عمرؓ نے ۲۰ رکعتیں پڑھنے کا طریقہ رائج کیا اور تمام صحابہ نے اس سے اتفاق کیا اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ زائد رکعتیں ۱۲ ہوتی تھیں۔

(۴) حضورؐ کے زمانہ سے لے کر حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانہ تک باقاعدہ ایک جماعت میں سب لوگوں کے تراویح پڑھنے کا طریقہ رائج نہ تھا، بلکہ لوگ یا تو اپنے اپنے گھروں میں پڑھتے تھے یا مسجدوں میں متفرق طور پر چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی شکل میں پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ اسی تفرق کو دور کر کے سب لوگوں کو ایک جماعت کی شکل میں نماز پڑھنے کا حکم دے دیا۔ اس کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس یہ حجت موجود تھی کہ حضورؐ نے خود تین بار جماعت کے ساتھ تراویح پڑھائی تھی۔ اس لئے اس فعل کو بدعت نہیں کہا جا سکتا۔ اور چونکہ حضورؐ نے اس سلسلہ کو یہ فرما کر بند کیا تھا کہ کہیں یہ فرض نہ ہو جائے اور حضورؐ کے گزر جانے کے بعد اس امر کا اندیشہ باقی نہ رہا تھا کہ کسی کے فعل سے یہ چیز فرض قرار پا سکے گی، اس لئے حضرت عمرؓ نے ایک سنت اور مندوب چیز کی حیثیت سے اس کو جاری کر دیا۔ یہ حضرت عمرؓ کے تفقہ کی بہترین مثالوں میں سے ایک ہے کہ انہوں نے شارع کے منشاء کو ٹھیک سمجھا اور امت میں ایک صحیح طریقہ

کو رائج فرما دیا۔ صحابۂ کرام میں سے کسی کا اس پر اعتراض نہ کرنا، بلکہ بسر و چشم اسے قبول کر لینا یہ ثابت کرتا ہے کہ شارع کے اس منشا کو صحابۂ کرام بھی اسی طرح سمجھتے تھے جیسا حضرت عمرؓ نے سمجھا۔ پھر حضرت عمرؓ نے شارع کے اس منشا کو بھی ٹھیک ٹھیک پورا کیا کہ "اسے فرض کے درجہ میں نہ کر دیا جائے"۔ چنانچہ کم از کم ایک بار تو ان کا خود تراویح میں شریک نہ ہونا ثابت ہے جب کہ وہ عبدالرحمان بن عبد کے ساتھ نکلے اور مسجد میں لوگوں کو تراویح پڑھتے دیکھ کر اظہار تحسین فرمایا۔

(۵) حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب باقاعدہ جماعت کے ساتھ تراویح پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا تو باتفاق صحابہ بیس رکعتیں پڑھی جاتی تھیں اور اسی کی پیروی حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانہ میں بھی ہوئی۔ تینوں خلفاء کا اس پر اتفاق اور پھر صحابہ کا اس میں اختلاف نہ کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے لوگ تراویح کی بیس ہی رکعتوں کے عادی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، اور امام احمد تینوں ۲۰ ہی رکعت کے قائل ہیں، اور ایک قول امام مالک کا بھی اسی کے حق میں ہے۔ داؤد ظاہری نے بھی اسی کو سنتِ ثابتہ تسلیم کیا ہے۔

(۶) حضرت عمر بن عبدالعزیز اور حضرت ابان بن عثمان نے ۲۰ کے بجائے ۳۶ رکعتیں پڑھنے کا جو طریقہ شروع کیا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ان کی تحقیق خلفاء راشدین کی تحقیق کے خلاف تھی بلکہ ان کے پیش نظر یہ تھا کہ مکہ سے باہر کے لوگ ثواب میں اہل مکہ کے برابر ہو جائیں۔ اہل مکہ کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ تراویح کی ہر چار رکعتوں کے بعد کعبے کا طواف کرتے تھے۔ ان دونوں بزرگوں نے ہر طواف کے بدلے چار رکعتیں پڑھنی شروع کر دیں۔ یہ طریقہ چونکہ اہل مدینہ میں رائج تھا اور امام مالک اہل مدینہ کے عمل کو سند سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے بعد میں ۲۰ کے بجائے ۳۶ کے حق میں فتوے دیا۔

(۷) علماء جس بنا پر یہ کہتے ہیں کہ جس بستی یا محلہ میں سرے سے نماز تراویح باجماعت ادا ہی نہ کی جائے اس کے سب لوگ گناہ گار ہیں وہ یہ ہے کہ تراویح ایک سنت الاسلام ہے جو عہد خلافت راشدہ سے تمام امت میں جاری ہے۔ ایسے ایک اسلامی طریقہ کو چھوڑ دینا اور بستی کے سارے ہی مسلمانوں کا مل کر چھوڑ دینا، دین سے ایک عام بے پروائی کی علامت ہے جس کو اگر گوارا کر لیا جائے تو رفتہ رفتہ وہاں

سے تمام اسلامی طریقوں کے مٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ اس پر جو معارضہ آپ نے کیا ہے اس کا جواب اوپر نمبر ۴ میں گزر چکا ہے۔

(۸) اس امر میں اختلاف ہے کہ تراویح کے لئے افضل وقت کونسا ہے، عشا کا وقت یا تہجد کا؟ دلائل دونوں کے حق میں ہیں، مگر زیادہ تر رجحان آخر وقت ہی کی طرف ہے۔ البتہ اول وقت کی ترجیح کے لئے یہ بات بہت وزنی ہے کہ مسلمان بحیثیت مجموعی اول وقت ہی کی تراویح پڑھ سکتے ہیں۔ آخر وقت اختیار کرنے کی صورت میں امت کے سوادِ اعظم کا اس ثواب سے محروم رہ جانا ایک بڑا نقصان ہے۔ اور اگر چند صلحاء آخر وقت کی فضیلت سے مستفید ہونے کی خاطر اول وقت کی جماعت میں شریک نہ ہوں تو اس سے یہ اندیشہ ہے کہ عوام الناس یا تو اُن صلحاء سے بدگمان ہوں یا ان کی عدم شرکت کی وجہ سے خود ہی تراویح چھوڑ بیٹھیں۔ یا پھر ان صلحاء کو اپنی تہجد خوانی کا ڈھنڈورا پیٹنے پر مجبور ہونا پڑے۔

ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ وھو اعلم بالصواب۔

چند متفرق سوالات

مندرجہ ذیل استفسارات کے جواب لکھنے کی تکلیف دے رہا ہوں:۔

سوال:

۱۔ آیت۔ یدبر الامر من السماء الی الارض ثم یعرج الیہ فی یوم کان مقدارہ الف سنۃ مما تعدون (السجدۃ آیت ۵) کا مفہوم میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس وقت میرے سامنے صرف تفسیر کشاف ہے صاحب کشاف کی توجیہات سے مجھے اتفاق نہیں ہے کیونکہ قرآنی الفاظ ان توجیہات کی تصدیق نہیں کرتے۔ ان پر تبصرہ لکھ کر آپ کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا آپ کے نزدیک اس آیت کا صحیح مطلب کیا ہے؟ لفظ یعرج الیہ کا لغوی مدلول پیش نظر رہنا چاہیے۔ نیز یہ لفظ الامر قرآن کی اصطلاح میں

کن کن معنوں میں مستعمل ہوتا ہے؟

۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ولقد خلقنا الانسان من سلٰلۃ من طین ۝ ثم جعلنٰہ نطفۃ فی قرار مکین ۝ ثم خلقنا النطفۃ علقۃ فخلقنا العلقۃ مضغۃ فخلقنا المضغۃ عظاماً فکسونا العظام لحماً ثم انشأنٰہ خلقاً اٰخر فتبارک اللہ احسن الخالقین (المؤمنون ۱۲ تا ۱۶) کی تشریح کرتے ہوئے علم الجنین کے جن مدارج ستہ کو قرآنی الفاظ کے ساتھ چسپاں کیا ہے اُس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے مولانا کے علم و فضل کی عظمت کے اعتراف کے باوجود مجھے اس بات کے اظہار کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ صحابہ کرام و سلف صالحین میں سے کسی نے بھی ان مدارج ستہ کو بیان نہیں کیا ہے ممکن ہے میں غلط فہمی کی بنا پر کہہ رہا ہوں؟ آپ اس مقام کا بغور مطالعہ کر کے اس "تحقیق جدید" کے بارہ میں اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔ نیز اگر آپ کو مولانا کی اس تشریح سے اختلاف ہو تو پھر فرمائیے کہ آپ کے نزدیک اس آیت کا مطلب کیا ہے اور قدیم تفسیر پر مولانا نے جو اعتراضات کئے ہیں آپ کے پاس ان کا کیا جواب ہے

(ملاحظہ ہو ترجمان القرآن ج ۲ ص ۵۴۰، ۵۴۴)

۳۔ مفردات القرآن (امام راغب) اور اساس البلاغۃ (زمخشری) کے بارہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟ قرآن سمجھنے کے لئے اگر کوئی لغت کی مفید و مستند کتاب معلوم ہو تو مطلع فرمایئے۔

۴۔ اسلامی شریعت میں مردوں کے لئے سونے چاندی کا استعمال ممنوع ہے کیا سونے یا چاندی کا پاندان اس ممانعت کی زد میں آسکتا ہے؟ اور گھڑی کے بعض حصوں میں سونے کے استعمال کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟

۵۔ امریکن سوپ فیکٹری رحیم یار خاں کے انگریز منیجر نے صابون کے اجزائے ترکیبی پر بحث کرتے ہوئے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ یورپ سے آنے والے خوشبودار سوپ میں

چربی کا استعمال ناگزیر ہوتا ہے ہر قسم کے جانور کی چربی کو استعمال کیا جاتا ہے خواہ وہ خنزیر ہو یا گائے۔ اِس انکشاف جدید کے بعد میں نے لکس، حمام وغیرہ کا استعمال ترک کر دیا ہے۔ اس مسئلہ میں آپ کی رائے کیا ہے؟ کیا آپ انگریزی خوشبودار سوپ استعمال کرتے ہیں؟

جواب:-

(۱) آیت یدبر الامر من السماء الی الارض متشابہات کے قبیل سے ہے۔ اس کا مجمل مفہوم تو سمجھ میں آسکتا ہے، مگر تفصیلی مفہوم متعین کرنا مشکل ہے، کیونکہ ہمارے پاس اس کے لئے کوئی ذریعۂ علم نہیں ہے۔ مجملاً جو کچھ سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ زمین کی تدبیر صرف زمین ہی پر نہیں ہو رہی ہے بلکہ وہ ہستی اس انتظام کو چلا رہی ہے جو سارے جہانِ وجود کی ناظم و مدبّر ہے۔ اِس تدبیر کا سررشتہ عالم بالا میں ہے جہاں زمین اور اس کے مختلف النوع معاملات سے متعلق ایک منصوبہ تیار ہوتا ہے، کارکنان قضا و قدر اِس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے پر مامور ہوتے ہیں، اور پھر وقتاً فوقتاً اِس کے ہر مرحلے کی تکمیل پر اپنی رپورٹ اوپر بھیجتے یا پیش کرتے ہیں۔ اِس منصوبے میں ایک ایک مرحلے کی اسکیم بسا اوقات ایک ایک ہزار سال اور پچاس پچاس ہزار سال کی ہوتی ہے۔ ہمارے لئے وہ ایک مدت دراز ہے، مگر مدبّرِ کائنات کے ہاں وہ گویا ایک دن کا کام ہے۔

یعرج الیہ کے لغوی مدلول کو ملحوظ رکھتے ہوئے اِس کا مطلب میری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ اِس سے مراد کارکنانِ قضا و قدر کا اپنے کام کی رپورٹ لے کر پیشی خداوندی میں جانا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ کام جو پہلے اسکیم کی حیثیت سے ان کے سپرد کیا گیا تھا، پایۂ تکمیل کو پہنچنے پر روداد کی شکل میں اوپر (Fovwarb) کیا جاتا ہے۔

الامر سے مراد ایسے مواقع پر "کائنات کا انتظام" ہوا کرتا ہے۔

(۲) آیت لقد خلقنا الانسان من سلٰلۃ من طین کی جو تشریح مولانا ابوالکلام نے کی ہے اس کا بیشتر حصہ صحیح ہے۔ ایسے معاملات میں قدیم مفسرین سے اختلاف کرنا قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ ظاہر

ہے کہ علم الاشیا کے متعلق انسان کی واقفیت جتنی بڑھے گی قرآن کے اس طرح کے بیانات کا مطلب پہلے سے زیادہ صحیح طریقے سے سمجھ میں آتا چلا جائے گا۔ یہ کوئی احکام شرعیہ، یا امور اعتقادیہ نہیں ہیں جن میں سلف کا فہم زیادہ معتبر ہو۔ البتہ اس کا وہ حصہ لائق اعتماد نہیں ہے جس میں انہوں نے اس آیت کا رشتہ بھی ڈارونی نظریہ ارتقار سے جوڑ دیا ہے۔ وہ ڈارونیت کے دلائل سے اس قدر مرعوب ہیں کہ علم جنین کے جو حقائق دراصل اس نظریہ کی تردید کر رہے ہیں انہی کو وہ اس کے شواہد میں شمار کرتے ہیں۔

(۳) مفردات امام راغب اور اساس البلاغہ قرآن کو سمجھنے میں ایک حد تک مدد تو ضرور دیتی ہیں لیکن بسا اوقات ان سے غلط تاویلات کے رستے پر بھی آدمی پڑ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن کی تاویل میں خود اپنا ایک مسلک رکھتے ہیں اور لغت کی تحقیق میں اپنے مسلک کے نظریات بھی داخل کر دیتے ہیں۔ اس لئے جن لوگوں کا منبع علم انہی کتابوں تک محدود ہے وہ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ ایک لفظ کی لغوی تشریح وہی کچھ ہے جو راغب اور زمخشری نے بیان کر دی ہے۔ میرے نزدیک اس کے بجائے لسان العرب، تاج العروس، نہایہ ابن اثیر، قاموس، جمہرۃ ابن درید اور ابن جریر کی لغوی تحقیقات زیادہ لائق اعتماد ہیں، کیونکہ یہ لوگ لغت میں خالص لغت سے بحث کرتے ہیں، اپنے نظریات کو دخل نہیں دیتے۔

(۴) سونے چاندی کا صرف پہننا ہی ممنوع نہیں ہے بلکہ ان کے برتن استعمال کرنا بھی ممنوع ہے۔ اس لئے ان کے پاندان کے جائز ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ رہی گھڑی، تو اس کے اندر کسی پرزے میں سونا لگایا گیا ہو تو وہ جائز ہو سکتا ہے۔ مگر باہر بطور زینت جو سونا چاندی استعمال کیا گیا ہو وہ جائز نہیں ہے۔

(۵) یہ امر تحقیق طلب ہے کہ حرام چیزیں کیمیاوی ترکیبات میں شامل ہو جانے کے بعد بھی آیا اپنی اصل کو باقی رکھتی ہیں یا نہیں؟ اور اگر یہ اصل باقی نہیں رہتی بلکہ کیمیاوی ترکیب ان کی ماہیت تبدیل کر کے ان کو اور ان کے ساتھ ملنے والی دوسری اشیا کو بھی ایک نئی چیز بنا دیتی ہے، تو کیا وہ نئی چیز بھی اس بنا پر حرام ہوگی کہ اس کے اجزار ترکیبی میں ایک حرام شے شامل تھی؟ یہ ایک دقیق مسئلہ ہے جس کو حل کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ پہلے مجرد ترکیب۔ اختلاط، آمیزش اور امتزاج کی نوعیت اور کیمیاوی ترکیب و تحول کی نوعیت کا فرق اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ نیز یہ بات بھی سمجھ لی جائے کہ کیمیاوی ترکیب سے اجزار ترکیب کی انفرادی ماہیتوں میں جو تغیرات

واقع ہوتے ہیں وہ اُن تغیرات سے اشبہ ہیں جو نباتات اور حیوانات کے جسم میں اجزاء غذا کے داخل ہونے کے بعد واقع ہوا کرتے ہیں۔

مسئلے کے اس پہلو کو ذہن نشین کر لینے کے بعد پہلے ماہرین فن سے یہ پوچھنا ضروری ہے کہ آیا صابن میں مجرد ترکیب واقع ہوتی ہے یا کیمیاوی ترکیب؟ یعنی آیا اس کے اجزاء کا اختلاط محض آمیزش کی نوعیت رکھتا ہے جس میں ایک ایک جز اپنی اصل باقی رکھتا ہو، یا یہ سب مل کر ایک کیمیاوی عمل کی بدولت اپنی ابتدائی ماہیت کھو دیتے ہیں اور ایک نئی چیز پیدا کرتے ہیں؟

اس کے بعد علماء کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ جو ترکیبات مؤخر الذکر نوعیت کی ہوں ان میں حرام اجزاء کی شمولیت کا کیا حکم ہے؟

اس تحقیق کی ضرورت خاص طور پر اس وجہ سے بہت شدید ہو گئی ہے کہ ہمارا ملک زیادہ تر خام اشیا پیدا کر کے بیچ دیتا ہے اور ہم ان کے بدلے میں ایسے ملکوں سے اپنی ضروریات کی بے شمار مصنوعات خرید رہے ہیں جہاں کے لوگ حرام و حلال کی تمیز سے قطعاً ناآشنا ہیں۔ اب یہ بات وقتاً فوقتاً ہمارے علم میں آتی رہتی ہے کہ فلاں چیز جو باہر سے درآمد ہوتی ہے اس میں فلاں حرام شے استعمال کی جاتی ہے، اور اس طرح کی خبریں سُن سُن کر آئے دن ہماری زندگی تلخ ہوتی رہتی ہے کہ کہیں ہم گناہ میں تو مبتلا نہیں ہو رہے ہیں۔ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ پہلے اصولی طور پر مختلف اقسام کے مرکبات کی شرعی حیثیت متعین کی جائے اور پھر ہر ایک کا حکم واضح طور پر بتا دیا جائے۔

میں اس معاملہ میں خود مذبذب ہوں اور قطعی رائے پر نہیں پہنچ سکا ہوں۔ البتہ اس پریشانی میں سب کے ساتھ شریک ہوں کہ وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی چیز کے متعلق یہ اطلاع کانوں میں پڑ جاتی ہے کہ اس میں کوئی حرام چیز شامل ہے۔ اب آپ نے صابن کے متعلق خبر سُنا کر ایک اور شک کا اضافہ کر دیا۔

"قتلِ مرتد" کے مسئلے پر ایک اعتراض

سوال: (۱) اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ..... الخ (سورۂ نساء) کی

تشریح کے سلسلے میں ایک میرزائی دوست نے یہ اعتراض اٹھایا ہے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے "قتلِ مرتد" میں یہ تحریر کیا ہے کہ جو ایک دفعہ اسلام لاکر اس سے پھر جائے، اسلام نے اس کے قتل کا حکم دیا ہے۔ لیکن قرآن میں دوسری دفعہ ایمان لانا مندرجہ بالا آیت سے ثابت ہے۔ براہِ کرم یہ اشکال رفع فرمائیں۔

(۲) اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ .... الخ (سورۂ نور) کا مفہوم کیا ہے؟

(۳) فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ ..... الخ (سورۂ انعام) کی تشریح بھی مطلوب ہے۔

جواب:

آیت اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا سے قتلِ مرتد کے مسئلے پر آپ کے قادیانی دوست نے جو اعتراض کیا ہے، وہ ان کی کم فہمی کا نتیجہ ہے۔ انہیں معلوم نہیں کہ قتلِ مرتد کا حکم تو اسی جگہ نافذ ہو سکتا ہے جہاں اسلامی حکومت موجود ہو، مگر مسلمان ان مقامات پر بھی پایا جا سکتا ہے جہاں نہ اسلام کی حکومت ہو، نہ ارتداد کی سزا دینی ممکن ہو۔ اس لئے آیت مذکورہ سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن کی رو سے تمام حالتوں میں کفر بعد الاسلام کے بار بار ارتکاب کا امکان ثابت ہوتا ہے جو قانون قتلِ مرتد نافذ ہونے کی صورت میں ناقابلِ تصور ہے۔ پھر آپ کے ان قادیانی دوست کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اسلامی قانون صدورِ ارتداد کے بعد فوراً ہی مرتد کو قتل کر دینے کا حکم نہیں دیتا، بلکہ اس کو اپنی غلطی محسوس کرنے اور توبہ کرنے کا موقع بھی دیتا ہے اور اگر وہ توبہ کر لے تو اسے معاف کر دیتا ہے۔ علاوہ بریں انہوں نے اس بات پر بھی غور نہیں کیا کہ یہ آیت ارتداد کی اُخروی سزا بیان کر رہی ہے۔ اور کسی جرم کا اخروی نتیجہ بیان کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے لئے کوئی دنیوی سزا نہ ہونی چاہیئے۔ جن گناہوں کی سزا قرآن میں بیان کی گئی ہے، ان میں سے متعدد ایسے ہیں جن کی دنیوی سزا کے علاوہ اخروی سزا کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً مسلمان کو عمداً قتل کرنا۔ اس لئے کہ بکثرت حالات ایسے ہو سکتے ہیں اور رونما ہوتے رہتے ہیں جن میں ایک شخص ارتکابِ جرم کرتا ہے اور دنیوی سزا سے بچا رہتا ہے۔ اسی

ارتداد کے معاملہ میں دیکھئے کہ اس کی دنیوی سزا صرف اُس وقت دی جا سکتی ہے جب کہ آدمی کا ارتداد علانیہ ہو، حکومت کے نوٹس میں آجائے، اور عدالت میں اس کا ثبوت بہم پہنچ جائے۔ مگر بکثرت ارتداد ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو مخفی طور پر واقع ہوں، اور بار بار توبہ کرنے کے بعد آدمی پھر کفر میں مبتلا ہوتا رہے۔ لہٰذا دنیوی سزا قانون میں تجویز کر دینے کے باوجود اخروی سزا کا ذکر ضروری ہے، اور کسی مقام پر محض اخروی سزا مذکور ہونے کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ اس جرم کے لئے دنیوی سزا نہیں ہے۔

اِس سلسلہ میں میرے لئے یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ "مرتد کی سزا" کا نام سنتے ہی قادیانی حضرات آخر کیوں اس قدر پریشان ہو جاتے ہیں؟ میں نے اپنی کتاب میں کہیں بھولے سے اشارہ تک ان کی طرف نہیں کیا ہے۔ پھر بھی وہ اس پر اتنے مشتعل ہیں کہ گویا انہی کے لئے سزائے موت تجویز کی گئی ہے۔ کیا وہ خود اپنے متعلق کسی شبہ میں پڑے ہوئے ہیں؟

آیت الخبیثٰت للخبیثین سے مراد یہ ہے کہ بدکار مردوں کے لئے بدکار عورتیں ہی موزوں ہیں، اور بدکار عورتوں کے لئے بدکار مرد ہی موزوں ہیں۔ پرہیزگار اہلِ ایمان کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے لوگوں سے رشتے جوڑیں۔

آیت فلما جن علیہ اللیل کی تفسیر کے لئے تفہیم القرآن ملاحظہ کیجئے۔ سورۂ انعام کی تفسیر میں اس آیت پر مفصل کلام کیا گیا ہے۔

اختلاف کے جائز حدود

سوال:

تحریک کا ہمدرد ہونے کی حیثیت سے اس کے لٹریچر اور جرائد و اخبارات کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ اب تک بزرگانِ دیوبند اور دوسرے علماء کی طرف سے جو فتوے شائع ہوتے رہے ہیں اور ان کے جو جوابات امیر جماعتِ ہند و امیر جماعتِ پاکستان و دیگر اراکین جماعت کی طرف سے دیے

گئے ہیں، سب کو بالالتزام پڑھتا رہا ہوں۔ اپنے بزرگوں کی اس حالت کو دیکھ کر بہت صدمہ ہوتا ہے مگر سوائے افسوس کے اور چارہ کوئی نظر نہیں آتا۔

ان فتووں کو دیکھ کر یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ تکفیر و تفسیق کا معاملہ جماعت اسلامی اور بزرگانِ دیوبند ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ جب ہم اسلافِ کرام و ائمۂ عظام کی سیرتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم ان بزرگوں کی سیرتوں میں بھی اس مسئلے کو مختلف فیہ پاتے ہیں۔ مثلاً ایک گروہ میں امام ابن تیمیہؒ، امام ابن حزمؒ اندلسی، امام ابن جوزیؒ وغیرہم اکابر ہیں، دوسرے گروہ میں امام ابن عربیؒ، امام غزالیؒ امام ولی اللہؒ جیسے بزرگ ہیں۔ ان میں سے پہلا گروہ کہتا ہے کہ لا الہ الا اللہ کا مطلب "لا معبود الا اللہ" ہے، دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اس کا مطلب "لا موجود الا اللہ" ہے۔ پہلا گروہ دوسرے گروہ کے اس عقیدے کو کفر و الحاد کہتا ہے، دوسرا گروہ اپنے اس عقیدے کو توحید کا اعلیٰ و اکمل درجہ تصور کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کلمہ جس کی تشریح کے لیے قرآن نازل کیا گیا اسی کے متعلق علمائے امت و ائمۂ وقت کا یہ اختلاف کیوں ہے؟

امید ہے کہ آپ اس مسئلے پر ترجمان القرآن میں مفصل بحث فرمائیں گے!

جواب:۔

کسی مفصل بحث کے بجائے آپ کی تشفی کے لیے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ قرآن مجید اپنے مدعا کو بغیر کسی ابہام کے صاف صاف بیان کرتا ہے، اور اس نے کسی ایسی حقیقت کو جس کا جاننا آدمی کی ہدایت کے لیے ضروری تھا، واضح کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔ مگر اختلافات پیش آنے کے دو بڑے اسباب ہیں:۔

ایک یہ کہ جب لوگ کسی قرآنی حقیقت کی اپنے الفاظ میں تعبیر کرتے ہیں اور قرآن کی حدود سے آگے بڑھ کر اپنی تشریحات پیش کرتے ہیں تو رائے کے اختلافات، اور بسا اوقات سخت اختلافات کی گنجائشیں نکل آتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ جب لوگ اپنے آپ کو ایسے سوالات کا جواب دینے کا مکلف سمجھتے ہیں جن کی تکلیف خدا اور رسول نے ان کو نہیں دی تھی تو جھگڑوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

اس پر بھی بات نہ بڑھے، اگر ایک شخص اپنے بیان پر اور دوسرا اس کی تردید پر قناعت کرے۔ لیکن پہلے بھی بارہا ایسا ہوا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے کہ ایک شخص اپنی بات کہنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اسے عین قرآن کی بات اور اس کے منکر کو صراحۃً یا کنایۃً قرآن کا منکر ٹھیرا دیتا ہے، اور دوسرا شخص اس کی تردید پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ اسے ضالّ و مضل، اور بسا اوقات کافر تک ٹھیرا دیتا ہے۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر ہر ایک کے متبعین اپنے اپنے پیشوا کی بات کی پچ کرتے ہیں اور مزید تشدد برتنے لگتے ہیں۔ ان طریقوں سے مختلف فرقوں کی بنا پڑ جاتی ہے اور ہر ایک دوسرے سے نماز اور مسجد اور شادی بیاہ تک کے تعلقات توڑ لیتا ہے، اور اپنے مخصوص مسائل پر کفر و ایمان کی بنا رکھ دیتا ہے۔

یہ ہے خرابی کا اصل سبب، ورنہ اگر نص کو نص کی جگہ رہنے دیا جائے اور تعبیر و تشریح و استنباط کو شکلِ نص نہ بنایا جائے، اور بحث کو صرف اختلافِ رائے کی حد تک ہی رہنے دیا جائے تو اکثر خرابیاں سرے سے رونما نہ ہوں، اور نہ وہ سوالات پیدا ہوں جن پر آپ نے پریشانی کا اظہار کیا ہے۔

جن بزرگوں کے آپ نے نام لیے ہیں، اور جن کے نام نہیں لیے ہیں اُن کے درمیان جن مسائل میں اختلافات، اور شدید اختلافات ہوئے ہیں ان میں سے اکثر مسائل پر مَیں بھی اپنی ایک رائے رکھتا ہوں، اور لامحالہ میری رائے اُن میں سے بعض کے موافق اور بعض کے خلاف ہے۔ مگر مَیں صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہنے پر ٹھیر جاتا ہوں، اس سے آگے بڑھ کر اُن لوگوں پر کوئی حکم چسپاں نہیں کرتا جن کی رائے سے مَیں نے اختلاف کیا ہے، اور نہ بحث کا یہ طریقہ اختیار کرتا ہوں کہ "میرے نزدیک فلاں شخص کی فلاں بات سے یہ لازم آتا ہے اور یہ کفر یا فسق یا ضلالت ہے، لہٰذا فلاں شخص ضالّ اور مضل یا کافر یا فاسق ہے"۔ اس طرح کے حکم لگانے کو میں حق سے تجاوز سمجھتا ہوں، کیونکہ ہماری منطق کی رُو سے اگر کسی شخص کے کسی قول سے ایک بُری بات لازم آتی ہو تو ہم اسے یہ الزام نہیں دے سکتے کہ اس "لازم" کا بھی وہ التزام کرتا ہے، اس لئے اُسے اس کا ملتزم ٹھیرا کر اس پر وہ حکم لگانا جو اس بُری بات کے ملتزم ہی پر لگایا جا سکتا ہو کسی طرح جائز نہیں۔

نمائش فقر کا مطالبہ

سوال:

آپ حضرات موجودہ برسرِ اقتدار طبقہ، اور امرا پر سخت تنقید کرتے ہیں، اس بنا پر کہ وہ زبان سے تو "اسلام اسلام" پکارتے ہیں، عوام اور غربا کی ہمدردی کا راگ الاپتے ہیں، مگر ان کے اعمال ان کے اقوال سے سراسر مختلف ہیں۔ لہٰذا خود آپ حضرات کے لیے تو یہ اشد ضروری ہے کہ (جب کہ آپ ایک اسلامی سوسائٹی برپا کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں) آپ کے اقوال و افعال میں کامل یکسانیت ہو۔ ورنہ آپ کی تنقید موجودہ امرا اور برسرِ اقتدار طبقہ پر بے معنی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ہم اپنی جائز کمائی سے اپنے آرام و آسائش کے سامان مہیا کریں، اچھی غذائیں کھائیں مگر کیا ایک ایسی سوسائٹی میں جہاں ہر طرف بھوک اور افلاس ہو، غریبی اور بے چارگی ہو، خصوصاً ایک داعی کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ اچھے ملبوسات استعمال کرے، عمدہ غذائیں کھائے اور ایک پُرتکلف زندگی گذارے؟ کیا رسول اللہ صلعم اور آپؐ کے صحابہ کی یہی روش تھی جب کہ وہ اسلامی تحریک کو پھیلانے میں مصروف تھے؟ آپ کے بعض ارکان کی ایک حد تک تعیشانہ (Luxurious) طرزِ زندگی کو دیکھ کر میرے اندر یہ سوال پیدا ہوا ہے۔

براہ کرم میرے ذہنی خلجان کو دور کر دیں۔

جواب:

مجھے نہیں معلوم کہ آپ نے جماعت کے کن لوگوں کو دیکھا ہے اور ان کی زندگی میں کیا چیز آپ کو تعیشانہ (Luxurious) نظر آتی ہے۔ اس لیے آپ کے سوالات کا جواب دینا میرے لئے مشکل ہے، جب تک کہ آپ کسی شخص کا اور اس تعیش (Luxury) کا تعین نہ فرمائیں جو آپ نے اس کی زندگی میں دیکھا ہے!

رہا صحابۂ کرام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگیوں کا معاملہ، جن کا آپ نے حوالہ دیا ہے، تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انہوں نے کبھی اپنی زندگی میں مصنوعی درویشی پیدا کرنے کی کوشش نہیں فرمائی، اور نہ محض اس غرض سے اپنے لباس، مکان اور خوراک کا معیار کمتر رکھا کہ دیکھنے والے ان کی فقیرانہ شان دیکھ کر داد دیں۔ وہ سب بالکل ایک فطری، سادہ اور معتدل زندگی بسر کرتے تھے، اور جس اصول کے پابند تھے وہ صرف یہ تھا کہ شریعت کے ممنوعات سے پرہیز کریں، مباحات کے دائرے میں زندگی کو محدود رکھیں، رزقِ حلال حاصل کریں اور راہِ خدا کی جدوجہد میں بہرحال ثابت قدم رہیں، خواہ اس میں فقر و فاقہ پیش آئے، یا اللہ کسی وقت اپنی نعمتوں سے نواز دے! جان بوجھ کر بُرا پہننا جب کہ اچھا پہننے کو جائز طریق سے مل سکے، اور جان بوجھ کر بُرا کھانا جب کہ اچھی غذا حلال طریقے سے بہم پہنچ سکے، ان کا مسلک نہ تھا۔ ان میں سے جن بزرگوں کو راہِ خدا میں جدوجہد کرنے کے ساتھ حلال روزی فراخی کے ساتھ مل جاتی تھی وہ اچھا کھاتے بھی تھے، اچھا پہنتے بھی تھے اور پختہ مکانوں میں رہتے بھی تھے۔ خوشحال آدمیوں کا قصداً بدحال بن کر رہنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی پسند نہیں فرمایا، بلکہ آپ نے خود ان کو یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی نعمت کا اثر تمہارے لباس اور کھانے اور سواری میں دیکھنا پسند فرماتا ہے۔

میری سمجھ میں کبھی ان لوگوں کی ذہنیت نہیں آسکی جو خود اپنے لیے تو اللہ کی ساری نعمتوں کو مباح سمجھتے ہیں اور دوسرے کسی شخص کا بھی اچھا کھانا اور اچھا پہننا ان کی نگاہوں میں نہیں کھٹکتا، مگر جہاں کسی نے اللہ کے دین کی خدمت کا نام لیا، پھر اس کا سادہ لباس اور سادہ کھانا اور معمولی درجے کا مکان اور فرنیچر بھی انکی نگاہوں میں کھٹکنے لگتا ہے اور ان کا دل یہ چاہنے لگتا ہے کہ ایسے شخص کو زیادہ سے زیادہ بدحال دیکھیں۔ شاید لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کی نعمتیں صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جو خدا کا کام کرنے کے بجائے اپنا کام کرتے رہیں۔ رہے خدا کا کام کرنے والے، تو وہ خدا کی کسی نعمت کے مستحق نہیں ہیں۔ یا پھر شاید ان کے دماغ پر راہبوں اور سنیاسیوں کی زندگی کا سکہ بیٹھا ہوا ہے اور وہ دینداری کے ساتھ رہبانیت کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں، اس لیے کھاتا پیتا دیندار ان کو ایک اعجوبہ نظر آتا ہے۔

اگرچہ جماعت کے بہت سے لوگ اس ذہنیت کے اعتراضات کے ہدف بنے رہتے ہیں، لیکن سب

سے بڑھ کر میری ذات ان کا نشانہ بنتی ہے۔ حالانکہ میرا نقطۂ نظر اس معاملے میں معترضین کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے۔ میرے نزدیک ہر وہ جائز سہولت جو آدمی کو دین کا کام بہتر اور زیادہ مقدار میں انجام دینے کے قابل بنائے نہ صرف جائز ہے بلکہ اس سے فائدہ اٹھانا افضل ہے اور اسے ترک کر دینا نہ صرف ایک حماقت ہے بلکہ اگر وہ اظہارِ درویشی کی نیت سے ہو تو ریاکاری بھی ہے۔ آپ خود غور کریں کہ ایک شخص اگر موٹر استعمال کر کے کم وقت میں زیادہ کام کر سکتا ہو تو وہ کیوں اسے استعمال نہ کرے؟ اگر وہ سیکنڈ کلاس میں آرام سے سفر کر کے دوسرے دن اپنی منزلِ مقصود پر پہنچتے ہی اپنا کام شروع کر سکتا ہو تو وہ کیوں تھرڈ کلاس میں رات بھر کی بے آرامی مول لے، اور دوسرا دن کام میں صرف کرنے کے بجائے تکان دور کرنے میں صرف کرے؟ اگر وہ گرمی میں بجلی کا پنکھا استعمال کر کے زیادہ دماغی کام کر سکتا ہو تو وہ کیوں پسینوں میں شرابور ہو کر اپنی قوتِ کار کا بڑا حصہ ضائع کر دے؟ کیا ان سہولتوں کو وہ اس لیے چھوڑ دے کہ خدا کی یہ نعمتیں صرف شیطان کا کام کرنے والوں کے لیے ہیں، خدا کا کام کرنے والوں کے لیے نہیں ہیں؟ کیا انہیں جائز ذرائع سے فراہم کرنے کی قدرت رکھتے ہوئے بھی خواہ مخواہ چھوڑ دینا اور کام کے نقصان کو گوارا کر لینا حماقت نہیں ہے؟ کیا معترضین کا مطلب یہ ہے کہ شیطان کے سپاہی ہوائی جہاز پر چلیں اور خدا کے سپاہی ان کا مقابلہ چھکڑوں پر چل کر کریں؟ یا وہ یہ چاہتے ہیں کہ کام ہو یا نہ ہو، ہم صرف ان کا دل خوش کرنے کے لیے اپنے آپ کو فقیر بنا کر دکھاتے پھریں؟

"پوسٹ مارٹم، شق صدر اور دل و دماغ"

سوالات :۔

۱۔ اسلامی حکومت میں نعشوں کی چیر پھاڑ (Post-mortem) کی کیا صورت اختیار کی جائے گی؟ اسلام تو لاشوں کی بے حرمتی کی اجازت نہیں دیتا۔ پوسٹ مارٹم دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک (Medico-legal) زیادہ تر تفتیش کے

لیے، دوسرے علم الامراض کی (Pathological) ضروریات کے لیے ممکن ہے کہ اول الذکر کی کچھ زیادہ اہمیت اسلامی حکومت میں نہ ہو، لیکن موخر الذکر کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس طریقے سے امراض کی تشخیص اور طبی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

۲۔ سُنا گیا ہے کہ رسول اللہ صلعم کا سینۂ مبارک چاک کیا گیا تھا اور اس کو تمام آلائشوں سے پاک کیا گیا تھا، تاکہ نبوت کے تقاضے کو پورا کر سکیں اور معصومیت کی صفت پیدا ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں آپؐ کا دل زیادہ روشن ہو جائے۔ اچھے اور پاکیزہ خیالات دل میں آئیں اور گناہ کے خیالات نہ آنے پائیں۔ یہ کہاں تک صحیح ہے؟

۳۔ اسی کے ساتھ ساتھ ختم اللہ علیٰ قلوبھم سے معاً یہ خیال آتا ہے کہ گویا دل خیالات کی ایک جلوہ گاہ (Agency) ہے۔ شاید اس زمانے میں جالینوس کے نظریات کے تحت "دل" کو سرچشمۂ افکار (Originator of Thought) سمجھا جاتا تھا، لیکن آج کل میڈیکل تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ دل صرف دورانِ خون کو جاری رکھنے والا ایک عضو ہے۔ اور ہر قسم کے خیالات اور حسیات اور ارادوں اور جذبات کا مرکز دماغ ہے۔ اس تحقیق کی وجہ سے ہر اس موقع پر الجھن پیدا ہوتی ہے جہاں "دل" سے کوئی ایسی چیز منسوب کی جاتی ہے جس کا تعلق حقیقت میں دماغ سے ہوتا ہے۔

جوابات:

۱۔ پوسٹ مارٹم کے مسئلے پر میں اب تک کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر سکا ہوں۔ یہ بھی مانتا ہوں کہ بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کے لیے یہ ناگزیر ہے، مگر اس کے باوجود طبیعت میں سخت کراہت پاتا ہوں، اور احکامِ شرعیہ میں بھی انتہائی ناگزیر صورت کے بغیر اس کے لیے کوئی گنجائش مجھے نظر نہیں آتی۔ بہرحال یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جسے ایک اسلامی حکومت میں اہلِ علم باہمی مشورے سے طے نہ کر سکتے ہوں۔

۲- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ مبارک کے چاک کیے جانے کا معاملہ متشابہات کے قبیل سے ہے۔ اسے سمجھنا ہمارے بس میں نہیں، اس لیے اس پر کسی تحقیق کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔

۳- "دل" کا لفظ ادب کی زبان میں کبھی اس معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے جس میں یہ لفظ علم تشریح (Anatomy) اور علمِ وظائف الاعضا (Physiology) میں استعمال ہوتا ہے۔ ادب میں "دماغ" (Cold Reason) کی نمائندگی کرتا ہے اور اس کے برعکس "دل" جذبات وحسیات اور خواہش اور ارادے کا مرکز مانا جاتا ہے۔ ہم رات دن بولتے ہیں کہ میرا دل نہیں مانتا، میرے دل میں یہ خیال آیا، میرا دل یہ چاہتا ہے۔ انگریزی میں (Qualities of Head & Heart) کا فقرہ بکثرت استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ الفاظ بولتے وقت کوئی شخص بھی علم تشریح والا دل مراد نہیں لیتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا آغاز اسی نظریہ کے تحت ہوا ہو جو جالینوس کی طرف منسوب ہے۔ لیکن ادب میں جو الفاظ رائج ہو جاتے ہیں وہ بسا اوقات اپنے ابتدائی معنی کے تابع نہیں رہتے۔

ہدایت و ضلالت کے درمیان

سوال:-

بڑی شدید ذہنی کشمکش میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ دو سال پیشتر جماعت سے متاثر ہوا اور تحریک سے ہمدردی کا تعلق قائم ہے۔ چنانچہ جب سے اب تک دوسروں کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ لیکن ایک مدت تک میں خود اپنے آپ کو عملی لحاظ سے کچھ بھی نہ بدل سکا۔ فروری ۱۹۵۱ء میں احساس پیدا ہوا اور اپنا محاسبہ کرنے پر توجہ ہوئی تو اپنے آپ کو صبغۃ اللہ میں رنگنے کا فیصلہ کر لیا۔ سینما سے قطعی پرہیز شروع کیا، گندے لٹریچر کو بھی چھوڑا، کاروبار میں بھی ایماندارانہ طریقے اختیار کر لیے، لیکن مہینہ ڈیڑھ مہینہ اپنے فیصلے کی سختی سے پابندی کرنے کے بعد ایک ناقابل فتح ذہنی تحریک کے تحت پھر سینما دیکھ ڈالا، پھر احساس

ہوا مگر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد جب کبھی اندرونی خواہش پیدا ہوئی، تو ہزار کوشش کے باوجود اس سے کبھی نجات حاصل نہ ہو سکی۔ لین دین میں ایک مرتبہ دانستہ امانت داری کے خلاف ایک حرکت کا ارتکاب کیا۔ نماز بھی چھوٹ گئی، ایک رشتہ دار لڑکی سے "معصوم سی" پرانی دلچسپی تھی وہ بھی عود کر آئی ہے اور اس سے خواہ مخواہ باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے، گانا ترک کر دیا تھا لیکن یہ ذوق بھی اب پھر ابھر آیا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ چونکہ اسلام کی دعوت کا کام بدستور اپنے حلقۂ اثر میں کر رہا ہوں لہٰذا یہ سب کچھ دوسروں سے چھپا کر کرتا ہوں اور برابر یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا ہوں کہ میں ایک صالح مسلمان ہوں۔ نمازوں میں سے صرف ایک نماز (عصر) جو دفتر کے اوقات میں آتی ہے (واضح رہے کہ میں اب ملازم ہوں) محض اس لیے ادا کرتا ہوں کہ کام کے ساتھیوں کو، جن میں دعوت کا کام کرتا ہوں مطمئن رکھ سکوں کہ میری زندگی دعوت کے عین مطابق ہے۔

اپنی اس حالت پر بار بار غور کیا، کبھی مایوسی ہوتی ہے، کبھی بے چینی، کبھی ندامت، کبھی روتا ہوں، کبھی دعائیں مانگتا ہوں، مگر عملی زندگی مطلوبہ نقشے پر استوار ہونے میں نہیں آتی۔ سوچتا ہوں کہ عمل کا دارومدار تعلق باللہ پر ہے، لیکن تعلق باللہ کیسے پیدا ہو؟ جماعت کے لٹریچر کا مسلسل مطالعہ کرتا ہوں مگر پھر بھی کچھ نہیں بنتا۔ مجھے رہنمائی بہم پہنچایئے کہ میں کیا کروں؟

جواب:۔

آپ نے جو حالات لکھے ہیں ان کو دیکھ کر میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ اپنے مرض کو طویل مدت تک پال لینے کے بعد اب علاج کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ آپ کو اول ہی روز یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ آدمی کا اپنے عقیدہ و علم کے خلاف کام کرنا (یعنی جسے وہ ایمانداری کے ساتھ فرض سمجھتا ہو اسے ادا نہ کرنا، اور جن کاموں کو وہ ناجائز سمجھتا ہو انہیں کر گزرنا) ایک سخت کمزوری ہے جو نہ صرف آدمی کے کیریکٹر کو بودا بنا دیتی ہے، بلکہ بتدریج اسے منافق بنا کر چھوڑتی ہے۔ پھر ایسے شخص کا دوسروں کو تبلیغ کرنا، اور اس خیال سے چھپ چھپ کر گناہ

کرتے رہنا کہ اگر علانیہ ان افعال کا ارتکاب کروں گا تو جنہیں میں تبلیغ کر رہا ہوں وہ مجھ پر حرف زنی کرینگے، یہ تو اپنے اندر منافقت کو پرورش کرنے کا یقینی نسخہ ہے۔ اگر آپ ابتدا ہی میں جب کہ یہ کمزوریاں آپ سے رونما ہو رہی تھیں مجھے اس کی اطلاع دے دیتے تو میں آپ کو اس سے بچانے کی کوشش کرتا، اور اس وقت یہ زیادہ آسان ہوتا۔ مگر اب آپ یہ مرض اچھی طرح پرورش کرنے کے بعد مجھے اطلاع دے رہے ہیں۔

بہرحال اب مجھے آپ کے بچنے کی ایک ہی صورت نظر آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ:

(۱) آپ برابر تبلیغ کرتے رہیں۔

(۲) جن کمزوریوں میں آپ مبتلا ہیں ان کو چھپانے کی کوشش نہ کریں۔ اگر ترکِ نماز کی بیماری آپ کے اندر موجود ہے تو کبھی لوگوں کے سامنے اس خیال سے نماز نہ پڑھیں کہ وہ آپ کو پابندِ نماز سمجھتے رہیں۔ اور اسی طرح اگر آپ سینما دیکھتے ہیں تو پھر علانیہ اسی جگہ سینما دیکھنے جائیں جہاں آپ لوگوں کے سامنے اس کے خلاف اظہارِ رائے کیا کرتے ہیں۔ اور پھر جب وہ آپ کو ملامت کریں تو اپنے اس فعل کی تاویلیں کرنے کی کوشش نہ کیجئے بلکہ ان سے کہئے کہ میں ضعفِ سیرت کا بیمار ہوں، مجھے اتنی ملامت کرو کہ آخر کار میرا یہ مرض دور ہو جائے۔

اس نسخے کو کچھ مدت آزما کر دیکھئے۔ اگر اپنے اندر کچھ ترقی محسوس کریں تو اس کی اطلاع مجھے دیجئے تاکہ میں آگے کی بات آپ کو بتاؤں۔ اور اگر یہ محسوس کریں کہ اس طریقِ کار سے آپ کے اندر اُلٹی ڈھٹائی پیدا ہو رہی ہے تو اس کی بھی اطلاع دیں، تاکہ میں دوسری تدبیر سوچوں۔

نکاحِ شغار کی تین صورتیں

سوال:۔ مسلمانوں میں عموماً رواج ہو گیا ہے کہ دو شخص باہم لڑکوں لڑکیوں کی شادی ادل بدل کے اصول پر کرتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی اشخاص مل کر اس طرح کا ادل بدل کرتے ہیں۔ مثلاً زید بکر کے لڑکے کے ساتھ، بکر عمر کے لڑکے کے ساتھ اور عمر زید کے لڑکے کے ساتھ اپنی لڑکیوں کا نکاح کر دیتے ہیں۔ ان صورتوں میں عموماً مہر کی ایک ہی مقدار ہوتی ہے۔

بعض علمائے دین اس طریقہ کو شغار کہتے ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ شغار کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے بلکہ حرام قرار دیا ہے۔

بحالاتِ موجودہ ایک غریب آدمی یہ طریقہ اختیار کرنے پر مجبور بھی ہوتا ہے، کیونکہ جس آسانی سے دوسرے لوگ اس کی لڑکی کو قبول کرنے پر تیار ہوتے ہیں اس آسانی سے اس کے لڑکے کو رشتہ دینے پر تیار نہیں ہوتے۔

براہِ کرم اس مسئلہ کی حقیقت واضح فرمادیں۔

جواب: - عام طور پر ادلے بدلے کے نکاح کا جو طریقہ ہمارے ملک میں رائج ہے وہ دراصل شغار کی تعریف میں آتا ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ شغار کی تین صورتیں ہیں اور وہ سب ناجائز ہیں۔

ایک یہ کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو اس شرط پر اپنی لڑکی دے کہ وہ اس کو بدلے میں اپنی لڑکی دیگا اور ان میں سے ہر ایک لڑکی دوسری لڑکی کا مہر قرار پائے۔

دوسرے یہ کہ شرط تو وہی ادلے بدلے کی ہو مگر دونوں کے برابر برابر مہر (مثلاً ۵۰، ۵۰ ہزار روپیہ) مقرر کئے جائیں اور محض فرضی طور پر فریقین میں ان مساوی رقموں کا تبادلہ کرلیا جائے۔ دونوں لڑکیوں کو عملاً ایک پیسہ بھی نہ ملے۔

تیسرے یہ کہ ادلے بدلے کا معاملہ فریقین میں صرف زبانی طور پر ہی طے نہ ہو بلکہ ایک لڑکی کے نکاح میں دوسری لڑکی کا نکاح شرط کے طور پر شامل ہو۔

ان تینوں صورتوں میں سے جو صورت بھی اختیار کی جائے گی، شریعت کے خلاف ہوگی۔ پہلی صورت کے ناجائز ہونے پر تو تمام فقہا کا اتفاق ہے البتہ باقی دو صورتوں کے معاملہ میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ لیکن مجھے دلائلِ شرعیہ کی بنا پر یہ اطمینان حاصل ہے کہ یہ تینوں صورتیں شغارِ ممنوع کی تعریف میں آتی ہیں اور تینوں صورتوں میں اُس معاشرتی فساد کے اسباب یکساں طور پر موجود ہیں جن کی وجہ سے شغار کو منع کیا گیا ہے۔

اہون البلیتین

سوال :-

"اختیارِ اَھوَنُ البلیتین" (دو بلاؤں میں سے کم درجے کی بلا کو اختیار کرنے کا مسئلہ) ایک سلسلے میں مجھ کو عرصہ سے کھٹک رہا ہے۔ آج کل اس مسئلہ کا استعمال کچھ اس طرح ہو رہا ہے کہ وضاحت ضروری ہو گئی ہے۔

ہم مسلمانوں میں سے چوٹی کے حضرات (جیسے علمائے دیوبند، مولینا حسین احمد مدنی۔ اور مولینا ابوالکلام آزاد) کا جماعت اسلامی کے پیش کردہ نصب العین سے دور ہو جانا ایک ایسا سوال ہے جس پر میں دل ہی دل میں برابر غور کرتا رہا ہوں۔ میرا خیال یہ ہوا کہ ان حضرات کی نگاہ میں اس نصب العین کا ترک کرنا اہون ہوگا لہذا انہوں نے ترک کیا اور جماعتِ اسلامی کے نزدیک اس کا قبول کرنا اہون ہوگا لہذا اس نے اسے اختیار کر لیا۔ میں اسی سوچ بچار میں تھا کہ ترجمان القرآن میں مولینا مدنی کی ایک تحریر پڑھی جس میں واقعی یہ اقرار موجود تھا کہ اھون البلیتین کو انہوں نے اختیار فرمایا ہے۔ اس پر مجھ کو حیرت ہوئی۔ پوری بات اور آگے چل کر کھلی جب "الانصاف" (انڈیا) میں جمعیت کی پالیسی کے متعلق مولینا کا یہ بیان نظر سے گذرا کہ کانگریس اور کمیونسٹ جو دو بلیتین تھیں ان میں سے ہم نے اہون یعنی کانگریس کو اختیار کیا ہے۔

میں یہ سمجھتا تھا کہ قرآن نے حالتِ اضطرار میں سؤر کا گوشت کھا لینے کی اجازت جہاں دی ہے وہاں بلیتین سے مراد اس حرام کے ترک یا اختیار کی دو متبادل صورتیں ہیں۔ یعنی یا تو آدمی سؤر کھا کر جان بچا لے یا نہ کھا کر مقامِ عزیمت پر فائز ہونے کی فضیلت حاصل کرے۔ لیکن کیا اس سے یہ بھی مراد ہے کہ دو حرام چیزوں میں سے ایک کو اہون سمجھ کر منتخب کیا جائے، مثلاً ایک طرف سؤر کا گوشت ہو اور دوسری طرف گدھ کا گوشت تو کیا ایک فاقہ

سے مرنے والا یوں سوچے گا کہ سؤر کا گوشت زیادہ ثقیل ہے اور گدھ کا گوشت زود ہضم ہے لہذا اہون گدھ کا گوشت ہوا۔

جواب:

اختیار اہون البلیتین سے مراد یہ ہے کہ جب دو ناجائز کاموں میں سے کسی ایک کا اختیار کرنا ناگزیر ہو جائے تو ان میں سے وہ اختیار کیا جائے جو کم تر درجے کا ناجائز کام ہو۔ اس میں شرطِ اول یہ ہے کہ خیر کی راہ بالکل بند ہو اور اسے اختیار کرنے کا قطعاً کوئی امکان نہ ہو۔ صرف اسی صورت میں آدمی کے لئے اہون البلیتین کو اختیار کرنا جائز ہو سکتا ہے، ورنہ خیر کی راہ کا کچھ بھی امکان ہو تو وہ شخص گنہ گار ہوگا جو محض اپنی کم ہمتی کی بنا پر اپنے آپ کو دو ناجائز کاموں میں سے کسی ایک میں مبتلا کر دے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ دو ناجائز کاموں میں سے ایک کو اہون بس یونہی نہ چھیڑ لیا جائے بلکہ اصولِ شریعت کے لحاظ سے دیکھا جائے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے کس بلا کو اہون اور کس کو اشد قرار دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً میں آپ ہی کی دی ہوئی مثال کو لیتا ہوں۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص سخت بھوک میں مبتلا ہے اور موت سے بچنے کے لئے اس کے سامنے صرف دو ہی غذائیں موجود ہیں، ایک سؤر کا گوشت، دوسرے گدھ کا گوشت۔ اب اگر وہ اسلامی نقطۂ نظر سے فیصلہ کرے تو لامحالہ گدھ کا گوشت اہون ہوگا، کیوں کہ اس کے حرام ہونے کی صراحت قرآن میں نہیں کی گئی ہے، بلکہ حدیث میں ایک اصول بیان کیا گیا ہے جس کا اطلاق گدھ پر بھی ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے سؤر کا گوشت اشد ہوگا، کیوں کہ قرآن میں اس کے حرام ہونے کی تصریح ہے۔ یا مثلاً کوئی طاقت ور ظالم کسی بے گناہ کی جان کے درپے ہو اور وہ بے گناہ آپ کے پاس پناہ لے اور آپ کسی طرح لڑ کر اس بے گناہ کو نہ بچا سکتے ہوں۔ ایسی صورت میں اگر وہ ظالم آ کر آپ سے اس کا پتہ پوچھے تو آپ کے لئے دو صورتیں ممکن ہوں گی۔ یا تو جھوٹ بول کر اس کی جان بچا لیں۔ یا اس کا پتہ بتا کر اسے قتل کے لئے پیش کر دیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں جھوٹ بولنا اہون ہے۔ کیوں کہ سچ بولنے سے ایک شدید تر برائی "یعنی قتلِ مظلوم" لازم آتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس جواب سے آپ کی تشفی ہو جائے گی۔

"تبلیغی جماعت" سے ایک دوستانہ شکایت

سوال: پچھلے دنوں سکھر میں تبلیغی جماعت کا ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا تھا جس میں ہندوستان و پاکستان کی تبلیغی جماعت کے امیر جناب مولانا محمد یوسف صاحب (صاحبزادہ و جانشین مولانا محمد الیاس صاحب مرحوم) خود تشریف لاتے تھے۔ جماعت اسلامی سکھر نے فیصلہ کیا کہ اس موقع پر جلسہ گاہ کے حدود میں اپنا ایک بک اسٹال لگائے۔ چنانچہ منتظمین سے مل کر انہوں نے دریافت کیا کہ آپ کو اس پر کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔ ان کے ایک ذمہ دار بزرگ نے جواب دیا کہ اس میں اعتراض کی کونسی وجہ ہو سکتی ہے۔ آپ شوق سے اپنا مکتبہ لگائیں۔ اس کے بعد ان سے اسٹال کے لیے جگہ بھی طے ہو گئی۔ مگر دوسرے روز شام کو جب فضل مبین صاحب امیر جماعت اسلامی سکھر نے وہاں جا کر اسٹال لگوانے کا انتظام شروع کیا تو انہیں یکایک اس سے منع کر دیا گیا۔ وجہ پوچھی گئی تو ایک ذمہ دار بزرگ نے جواب دیا کہ "ہماری مجلس شوریٰ نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم نہ آپ کو مکتبہ لگانے کی اجازت دیں گے اور نہ آپ سے کسی قسم کا دوسرا تعاون لیں گے۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ ایک سیاسی جماعت ہیں"۔ اس جواب اور اس طرزِ عمل پر جو تعجب ہوا، اس پر مزید تعجب اس بات پر ہوا کہ وہاں دوسرے متعدد بک اسٹال موجود تھے اور اس پر ان حضرات کو کوئی اعتراض نہ تھا، مگر جماعت اسلامی کے متعلق ان کی خواہش یہ تھی کہ ان کی جلسہ گاہ سے ایک میل تک بھی اس کا مکتبہ نظر نہ آئے۔

اس پر ۱۱ اپریل کو ڈاکٹر سلیم الدین صاحب امیر جماعت اسلامی حلقۂ بالائی سندھ، فضل مبین احمد صاحب امیر جماعت شہر سکھر، اور مولوی قربان علی صاحب رکن جماعت، مولانا محمد یوسف صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے عرض کیا کہ "اب تک تو ہم یہی سمجھتے تھے کہ جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت مقصد میں متحد ہیں اور صرف طریق کار میں فرق ہے لیکن یہ سلوک جو ہمارے ساتھ کیا گیا ہے، یہ اس باہمی اخلاص اور تعاون کو نقصان

پہنچانے والا ہے جو دین کی خدمت کرنے والی ان دو جماعتوں کے درمیان اب تک رہا ہے اور ہمیشہ رہنا چاہیے۔ کیا آپ واقعی ہمیں محض ایک سیاسی جماعت سمجھتے ہیں؟" اس پر حضرت جی (مولانا محمد یوسف صاحب اسی نام سے یاد کیے جاتے ہیں) نے فرمایا:۔

"میں اس مکتبے وغیرہ کے سخت خلاف ہوں۔ اور یہ لوگوں نے طریقہ بنا لیا ہے کہ وہ لوگوں کی جیبوں سے پیسے حاصل کرنے کے لیے کتابیں لکھتے ہیں۔ اسی علم نے یہ خرابیاں پیدا کی ہیں۔ فساد کی جڑ یہی ہے۔ میں کتابیں لکھنے، اخبار چھاپنے اور اسی قسم کی چیزیں کرنے کا سخت مخالف ہوں۔ اصل میں انہی چیزوں نے مسلمانوں کو بے عمل کر دیا ہے اور یہ چیزیں مجاہدے کا بدل نہیں ہو سکتیں۔"

یہ ارشاد سُن کر ہمیں دوگونہ حیرت ہوئی۔ ایک اس بنا پر کہ حضرت جی اگر مکتبے وغیرہ کے ایسے ہی سخت خلاف تھے تو جماعت اسلامی کے سوا دوسرے مکتبے جلسہ گاہ میں کیوں برداشت کیے گئے؟ دوسرے اس بنا پر کہ کتابوں اور رسائل کی اشاعت اور قیمتاً ان کو فروخت کرنے کا گناہ تو دیوبند اور سہارنپور اور تھانہ بھون کے بزرگ بھی کرتے رہے ہیں، بلکہ خود تبلیغی جماعت کے بھی متعدد نامور بزرگوں سے اس کا صدور ہوا ہے۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ وہ یہی کام کریں تو خدمت دین، اور دوسرے کریں تو صرف پیسے بٹورتے ہیں؛ پھر "اکرام مسلم" کا بھی یہ عجیب تصور ہمارے لیے باعث حیرت تھا کہ فسق کے علمبرداروں کے خلاف زبان کھولنا تو اکرام مسلم کے خلاف ہو، مگر ایک دینی خدمت کرنے والی جماعت کے کام اور مقصد کا کھلم کھلا استخفاف کرنا اور اس کی نیت تک پر حملہ کرنا عین اکرام مسلم ہو۔

اس کے بعد حضرت جی نے فرمایا: "آپ تو حکومت کے طالب ہیں۔ آپ اس چیز کے طالب ہیں جو مردود ہے۔ حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت حکومت پیش کی گئی مگر آپ نے اس کو رد کر دیا، ٹھکرا دیا، اور نبوت عبدیت قبول کی۔ آپ کا یہ خیال کہ حکومت و بادشاہت میں تبدیل ہو جائے تو اسلام زندہ ہو جائے گا بالکل غلط ہے۔"

حاضرین میں سے ایک صاحب کے اس سوال پر کہ کلمۃ الحق عند سلطان جائر کے کیا معنی ہیں، حضرت نے فرمایا یہ اُس وقت کے لیے ہے جب پورا معاشرہ درست ہو اور صرف حکومت میں خرابی نظر آتی ہو۔ اس وقت کلمۂ حق کہنا درست ہے تاکہ جو خرابی ابھی صرف حکومت تک محدود ہے وہ آگے نہ بڑھنے پاتے۔ اِس وقت یہ موقع نہیں ہے۔

دورانِ گفتگو میں حضرت جی نے یہ بھی فرمایا کہ اُس وقت جو لوگ برسرِ اقتدار ہیں وہ تم سے بہتر ہیں۔ ایمان میں، اعمال میں، تدبیر میں اور قابلیت میں وہ آپ سے بہتر ہیں۔ آپ ان کے بجائے کون سے لوگ لائیں گے؟"

اب سوال یہ ہے کہ اس جماعت کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے؟ یہ سوال اس لیے کیا جا رہا ہے کہ اگر دو چار جگہ اور اسی طرح کے تلخ تجربات ہوتے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ان دو دینی جماعتوں کے درمیان باہمی اکرام و اخلاص اور ہمدردی کا جو تعلق اب تک رہا ہے اس میں فرق واقع ہو جائے۔ لہٰذا اس باب میں جماعت کے کارکنوں کو واضح ہدایات مل جانی چاہئیں۔

جواب:۔ یہ روداد، جو جماعت اسلامی کے ذمہ دار کارکنوں نے ہمارے پاس بھیجی ہے، اسے پڑھ کر فی الواقع ہمیں دلی صدمہ ہوا۔ اس سے پہلے مشرقی پاکستان سے ہمارے پاس یہ شکایت آئی تھی کہ وہاں کے ایک بڑے سرکاری عہدہ دار، جو تبلیغی جماعت میں بھی نمایاں مقام رکھتے ہیں، مختلف مقامات پر دارالمطالعے قائم فرما رہے ہیں اور ان میں یہ شرط لگا دیتے ہیں کہ جماعت اسلامی کا لٹریچر ہرگز نہ آنے پائے۔ ہم نے اسے ان کا ایک ذاتی فعل سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ مگر اب خود مولانا محمد یوسف صاحب کی موجودگی میں تبلیغی جماعت کی مجلسِ شوریٰ کا فیصلہ اور پھر مولانا موصوف کا اس کی توثیق فرمانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ کسی فردِ خاص کا انفرادی رجحان نہیں ہے بلکہ یہ ایک اجتماعی روش ہے۔ اس پر سوائے اس کے کہ افسوس کیا جائے، اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

بہرحال، جماعت اسلامی کے کارکنوں کو اس پر بُرا نہ ماننا چاہیے۔ اب نہ سہی کسی نہ کسی وقت انشاء اللہ ان حضرات کو اس طرزِ عمل کی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔ خدمتِ دین کے لیے دو یا دو سے زیادہ گروہ اپنے اپنے طریقے کے مطابق کام کر سکتے ہیں، اور ایک دوسرے کے طریقے سے اختلاف بھی رکھ سکتے ہیں، مگر یہ بات

ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ ان میں سے کوئی گروہ بھی آخر کیوں اس میدان میں صرف اپنے آپ ہی کو دیکھنا چاہے اور دوسرے کے وجود کو برداشت نہ کرے؟ دین کی خدمت کوئی کاروبار تو نہیں ہے کہ یہاں ایک خادم دوسرے کو اپنا رقیب سمجھے؛ رقابت تو دوکانداروں میں ہوتی ہے۔ یہ کام اگر ہم دوکانداری کے طور پر کر رہے ہیں تو ہم پر اور ہمارے اس کاروبار پر ہزار لعنت۔ اور اگر یہ اخلاص کی بنا پر خدا کے دین کی خدمت ہے، تو ہم میں سے ہر ایک کو خوش ہونا چاہیے کہ یہ کام تنہا وہی نہیں کر رہا ہے، دوسرے بھی اس میں سرگرم کار ہیں۔ اس لیے خواہ کوئی ہمیں رقیب ہی سمجھ کر دور پھینکنے کی کوشش کرے، ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اسے رقیب نہ سمجھیں اور بار بار اس کے قریب جائیں، یہاں تک کہ اللہ اس کا دل بھی بدل دے۔

ہماری سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آتی کہ بعض علماء، اور ارباب حکومت اور بعض دوسرے گروہ کچھ مدت سے یہ کوشش کیوں کر رہے ہیں کہ جماعت اسلامی کا لٹریچر کسی طرح ان کے حلقۂ اثر میں نہ پہنچنے پائے۔ کہیں اس کے پڑھنے پڑھانے سے منع کیا جا رہا ہے۔ کہیں دار المطالعوں اور کتب خانوں میں اس کی آمد کو روکا جا رہا ہے۔ کہیں اُن لوگوں کو مدرسوں اور ملازمتوں سے نکالا جا رہا ہے جن کے پاس یہ لٹریچر دیکھا گیا۔ کہیں دوسرے طریقوں سے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ لوگ اس لٹریچر سے آشنا ہی نہ ہونے پائیں۔ بلکہ کہیں تو یہاں تک کہا جا رہا ہے کہ جماعت اسلامی کی کوئی چیز سنو بھی نہیں۔ ہم حیران ہیں کہ یہ کان اور آنکھیں بند کرنے کی تدبیریں آخر کس وجہ سے کی جا رہی ہیں؟ ہمارے دلوں میں تو کبھی اس کا خیال تک بھی نہیں آیا کہ ہم سے تعلق رکھنے والے لوگ کسی کی چیز پڑھنے اور کسی کی بات سننے سے احتراز کریں۔ جماعت کے ارکان اور متفقین ہر قسم کی چیزیں پڑھتے ہیں۔ ہر ایک کی بات کھلے دل اور کھلے کانوں سے سنتے ہیں۔ جماعت خود یہ کوشش کرتی ہے کہ اس کے حلقے کے لوگ دنیا بھر کی چیزیں پڑھیں اور سنیں تاکہ ان کی نظر وسیع ہو اور وہ زیادہ اچھی طرح رائے قائم کرنے کے قابل ہوں۔ حد یہ ہے کہ جماعت کے خلاف جس جس گروہ کی طرف سے جتنا کچھ بھی لکھا جاتا ہے وہ سب جماعت کے حلقوں میں آزادی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ پھر یہ ہمارے دوسرے بھائیوں کو آخر کیا ہوا ہے کہ وہ ہمارے معاملے میں چشم بندی و گوش بندی کی پالیسی کو ترجیح دیتے ہیں؟ کیا یہ اس بات کا کھلا اعتراف نہیں ہے کہ وہ اپنے موقف کی کمزوری اور ہمارے موقف کی مضبوطی کا خود احساس رکھتے

ہیں؟ کیا اس کا صاف مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے دائرۂ اثر کے لوگوں کو تاریکی میں رکھنا چاہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ بس اسی وقت تک ان کے اثر میں ہیں جب تک یہ ان کی بنائی ہوئی محفوظ پناہ گاہ میں محصور ہیں؟ اور کیا خود وہ لوگ جو اپنے اُستادوں اور پیروں اور سرداروں کے باندھے ہوئے اس حصار میں رہنے پر راضی ہو جاتے ہیں اپنی جگہ یہ نہیں سوچتے کہ ایک بہتر اور مضبوط موقف رکھنے والا کب اس بات سے ڈرا کرتا ہے کہ دوسرے کسی شخص کے دلائل سن کر اس کے حلقۂ اثر کے لوگ متزلزل ہو جائیں گے۔

مولانا محمد یوسف صاحب کے متعلق ہمیں یہ بدگمانی نہیں ہے کہ انہوں نے ہماری دعوت کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد اس کا یہ خلاصہ نکالا ہوگا کہ "ہم بس حکومت چاہتے ہیں"۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ بے چارے خود اُس حصار کے شکار ہوتے ہیں جو مذہبی گھرانوں میں پرورش پانے والوں کے گرد عموماً کھینچ دیا جاتا ہے۔ اس حصار میں محصور ہونے کی وجہ سے انہوں نے ہماری کوئی چیز نہ پڑھی، نہ پڑھنے کی ضرورت محسوس کی۔ محض سنی سنائی باتوں سے ہماری دعوت کا یہ عجیب سا خلاصہ نکال لیا۔ اگر وہ ایک مخلص خیر خواہ کی گزارش کو قابل توجہ سمجھیں تو ان سے عرض کیا جائے کہ اگر رائے زنی کرنی ضروری ہی ہو تو اظہار رائے سے پہلے اس چیز سے واقفیت بہم پہنچانی چاہیے جس پر آپ رائے ظاہر کر رہے ہوں۔ اور اگر آپ کو اس کی فرصت نہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ ناکافی معلومات کی بنا پر آپ کوئی رائے ظاہر نہ فرمائیں۔

ایک اور فتوے

سوال:

یہاں سے فتوے دریافت کرنے کے لئے مولانا مولوی کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم دہلی کے پاس روانہ کیا گیا تھا کہ مولانا مولوی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی اتباع جائز

ہے یا ناجائز ہے۔

جواب وہاں سے یہ آیا کہ مولانا مولوی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کسی بھی امام کے قائل نہیں ہیں۔ آزاد خیال آدمی ہیں۔ اس لئے ان کا اتباع شرعاً ناجائز ہے۔

اس لئے آپ سے استدعا ہے کہ آپ اپنے خیال کا اظہار فرمائیں۔

جواب:

میں حیران ہوں کہ جن لوگوں نے مولانا کفایت اللہ صاحب سے یہ سوال کیا تھا انہوں نے یہ کیوں نہ سوچا کہ یہی مولانا کفایت اللہ صاحب تیس سال سے گاندھی اور نہرو کا اتباع فرما رہے ہیں اور آج بھی انہوں نے یہ فتوے دیا ہے کہ مسلمانوں کو کانگریس کے حق میں ووٹ دینا چاہیئے۔ کیا کانگریس کسی امام کی قائل ہے؟ بلکہ کیا کانگریس خدا اور رسول کو بھی مانتی ہے؟ پھر جو عالم دین کانگریس کے معاملہ میں تو اماموں کو ماننے یا نہ ماننے کا لحاظ نہ کرے، مگر جماعت اسلامی کے معاملہ میں اسے امام یاد آنے لگیں کیا وہ اس قابل بھی ہے کہ اس کے فتوے کا لحاظ کیا جائے؟

سوال:

آپ کس امام کے پیرو ہیں؟

جواب:

میں اصل میں تو صرف ایک امام کا پیرو ہوں جس کا نام نامی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے البتہ فقہی مسائل میں میرا طریقہ یہ ہے کہ جس مسئلے کی تحقیق کا مجھے موقع نہیں ملتا اس میں امام ابوحنیفہؒ کی پیروی کرتا ہوں، کیوں کہ ان کے مذہب کے اکثر مسائل کو میں نے اپنے اصلی امام کی تعلیم کے زیادہ موافق پایا ہے۔ مگر جس مسئلے میں مجھے تحقیق کا موقع مل جاتا ہے اس میں چاروں اماموں کے مذہب پر نظر ڈالتا ہوں اور جس کی تحقیق کو قرآن و حدیث کے منشا سے زیادہ قریب پاتا ہوں اس کی پیروی کرتا ہوں۔

شکاری کتّے، بندوق اور تیر کے ذریعے شکار

مندرجہ ذیل سوالات کا جواب مطلوب ہے:

سوال:

(۱) تکبیر پڑھ کر بندوق چلانے سے شکار اگر بغیر حلال کئے مرجائے تو وہ حلال ہے یا حرام؟

(۲) اسی طرح تکبیر پڑھ کر تیر چلانے سے اور شکاری کتّا چھوڑنے سے جو شکار بغیر ذبح کئے مرجائے اُس کا حکم کیا ہے؟

(۳) اسلامی تاریخ یا کسی اور کتاب کے مطابق بندوق کی ایجاد کس سنہ ہجری میں ہوئی ہے؟

جواب:

تکبیر پڑھ کر بندوق چلانے سے شکار اگر ذبح کئے بغیر مرجائے تو میرے نزدیک حلال ہے۔ میں اسے تیر پر قیاس کرتا ہوں لیکن علماء کو اس سے اختلاف ہے کیونکہ وہ بندوق کی گولی کو غلیل کے غلّے پر قیاس کرتے ہیں۔ عملاً میں خود بھی ایسے جانور کو کھانے سے پرہیز کرتا ہوں۔

تکبیر پڑھ کر تیر چلانے سے جو شکار مرجائے وہ بالاتفاق حلال ہے، اس کی تصریح حدیث میں آچکی ہے۔ اسی طرح جس کتے کو خدا کا نام لے کر شکار پر چھوڑا گیا ہو — بشرطیکہ وہ سدھا ہوا کتا ہو — اس کا مارا ہوا شکار بھی بالاتفاق حلال ہے۔ خود قرآن میں اس کی تصریح ہے۔

بندوق کی ایجاد کے متعلق مجھے اس وقت یاد نہیں کہ کس سنہ ہجری کی ایجاد ہے۔ غالباً پندرہویں صدی عیسوی سے پہلے یہ چیز دنیا میں موجود نہ تھی۔

اعتذار: چند در چند وجوہ سے ترجمان کا یہ شمارہ دیر سے شائع ہو رہا ہے اور صفحات میں بھی ۱۶ کی کمی ہے۔ انشاء اللہ آئندہ دو ماہ میں اسکی تلافی کر دی جائے گی۔ — مینیجر